فلسفۂ اقبال کے نفسیاتی منابع

از

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

۱۹۶۶ء

فلسفۂ اقبالؒ کے نفسیاتی منابع

جناب صدر، خواتین و حضرات ! میرے لیے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ اس جامعہ میں یادگارِ اقبال کے خطبہ کے لیے مجھے یاد کیا گیا، کیونکہ میں یہاں کچھ عرصے کے لیے شعبۂ تاریخ کے صدر کی خدمات انجام دے چکا ہوں اور اس تعلق کی بنا پر اب بھی اپنے آپ کو اس قدیم درس گاہ سے وابستہ سمجھتا ہوں، اور جب کبھی مجھے یہاں سے کسی خدمت کی دعوت دی جاتی ہے تو میں نہ صرف اسے مسترد کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا بلکہ اسے قبول کرنے میں دلی مسرت محسوس کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی ہیچ مدانی کے باوجود علامہ اقبال کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش میں شریک ہونا میرے لیے بذاتِ خود ایک سعادت ہے، اس لیے کہ ہماری ملّت کی تعمیر میں جن عوامل نے حصّہ لینے کا کام کیا ہے وہی فلسفۂ اقبال کی تشکیل میں کارفرما تھے۔ اور چونکہ ہماری ملّت کا استحکام اسی طرح ممکن ہے کہ ان عوامل کا نفوذ کم نہ ہونے پائے یہ ضروری ہے کہ ہمارے ذہنوں میں فلسفۂ اقبال کا ادراک کمزور نہ پڑے، خصوصاً قوم کے باشعور طبقوں کی توجہ اس کی طرف متواتر مبذول کرائی جائے تاکہ ہماری ملّت شعوری طور پر اسے اپنا نظریۂ حیات بنائے رکھے۔ افسوس ہے کہ اپنے فہم کی کوتاہی کے باعث ہماری زندگی کے بہت سے شعبے فلسفۂ اقبال اور خود اصول اسلام کی روشنی سے فی الوقت خالی نظر آتے ہیں اور انھیں روشن کرنے کی ضرورت کا احساس بھی کمزور پڑتا جاتا ہے۔ چونکہ ہماری ملّت کی اساس کے لیے یہ تاریکی فال نیک نہیں ہے، اس لیے ان خطرات کی طرف جو پیدا ہو چلے ہیں ملت کی توجہ مبذول کرانے کے لیے ضروری ہے کہ جن افراد کو ان خطرات کا احساس ہے اور جو فلسفۂ اقبال کی اہمیت سے واقف ہیں، وہ اپنی مساعی کی رفتار تیز تر کر دیں۔ اسی وجہ سے میں نے عرض کیا کہ اس مقصد کے حصول میں ادنیٰ شرکت بھی باعثِ سعادت ہے۔

ہر قوم کا وجود اس کے عقائد و تصوّرات پر قائم ہوتا ہے، اس لیے کہ افراد کو مقاصد کی ہم آہنگی ہی کسی تنظیم میں منسلک کرتی ہے۔ اگر یہ مقاصد دیرپا نہ ہوں تو افراد کا اتحاد بھی دیرپا نہیں ہو سکتا۔ جب مقاصد ایسے ہوتے ہیں جو قومی مساعی کے لازوال محرک بن سکیں تو وہ عقائد و تصوّرات میں منتقل ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ قومیں وہی کرنا چاہتی ہیں جسے وہ مفید سمجھتی ہیں۔ منتہائے افادیت ایک طویل العرصہ لازوال منزل ہوتی ہے جس کی بنیاد فلسفہ

زندگی پر قائم ہوتی ہے اور فلسفۂ حیات، عقائد و تصورات ہی کا دوسرا نام ہے۔ ان عقائد و تصورات میں بلندی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس مدت کو زیادہ سے زیادہ طول دیا جائے جس میں ان کا وجود محرک بن سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتہائے طوالت اسی طرح حاصل ہوتی ہے کہ مدت غیر متناہی ہو یعنی مادی وقت کی حدود سے باہر ہو، اس لیے کہ موجودہ فلسفہ کی رُو سے چونکہ وقت اُس مادی عالم کون و مکان کا ایک عرض ہے وہ بھی محدود ہے اور لامتناہی اور غیر محدود وسعت اس کے اندر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر مقاصد کی لامحدود بلندی مقصود ہے تو ملت کے لیے لازمان ہونا ضروری ہے، اور اگر ملت کا وجود وقت کی حدود سے آزاد ہو تو وہ مکان کی حدود میں قید نہیں ہو سکتی اس لیے کہ مکان کا لازمی عرض وقت ہے، اور چونکہ ملت اس عرض میں نہیں سما سکتی یہ لابد ہے کہ وہ لامکان بھی ہو۔ اسی وجہ سے اقبال کا عقیدہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ لامکان و لازمان ہے، مگر یہ لامکانیت اور لازمانیت بظاہر افراد کو حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ان کی حیات محدود ہوتی ہے اور وہ اس مادی دنیا میں زندگی گذارتے ہیں۔ چونکہ ملت افراد سے بنتی ہے اس کی لازمانیت و لامکانیت کا فرد کی زندگی کی محدودیت سے تضاد دُور کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ فرد کو مادی قیود سے آزادی حاصل نہیں ہو سکتی لیکن اس کی خودی یعنی انا میں ان قیود کے اثرات پر قابو پانے کی صلاحیت موجود ہے اور اس کی بلندی اور قوت سے فرد اپنی پرواز و ترقی کو لامحدود بنا سکتا ہے۔ انا کی اس ترقی کے لیے ضروری ہے کہ فرد کے تصورات و عقائد صحیح ہوں ورنہ غلط تصورات جھوٹے بتوں کی طرح اسے کبھی ترقی و فلاح کے راستے پر نہ چلنے دیں گے۔

لازمانیت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ملت اور انا دونوں ایک مسلسل سعی اور جدوجہد میں مشغول رہیں۔ اس لیے کہ حیات حرکت اور موت کے خلاف پیکار ہی کا نام ہے۔ چنانچہ حق و باطل کی ازلی جنگ انسان کی زندگی کا عنصر ہے۔ اگر انسان کو یہ مرحلہ دائماً پیش نہ ہوتا تو وہ ملائکہ یا شیاطین کے زمرہ میں داخل ہوتا۔ کیونکہ اوّل الذکر کو نیکی کے لیے سعی کی ضرورت نہیں ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ان کی سرشت میں نیکی کے علاوہ کوئی عنصر موجود نہیں ہے اور شیاطین کو نیکی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ انسان کا درجہ ملائکہ اور شیاطین دونوں سے بلند اسی باعث ہے کہ وہ پیکار کی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے ذریعے سے علو درجات حاصل کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ازل سے چراغِ مصطفویؐ، شرارِ بولہبی سے ستیزہ کار ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال کے فلسفہ کا یہ بنیادی تصور ہے جو میں نے مختصر طور پر ابھی آپ کے سامنے بیان کیا۔ اقبال کے دوسرے تصورات کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں، اس بنیادی تصور کے شاخسانے اور فروع ہیں۔ ہر فلسفہ کا ایک مرکزی تصور ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کسی فلسفہ میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی مرکزی تصور نہ ہو تو انسانی فکر کسی حالت میں بھی ایسا نظامِ خیال مرتب نہیں کر سکتی جو معنی خیز ہو، اس لیے کہ پھر مختلف خیالات پریشان اور غیر مرتب رہیں گے۔

اس کے مقابلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کوئی مرکزی یا اساسی تصوّر یوں ہی دماغ میں نہیں آجاتا۔ جب انسان کے مشاہدے میں بہت سے واقعات آتے ہیں تو وہ ان میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور جو واقعات مربوط نہ ہوسکیں وہ معنی خیز نہیں ہوتے، اس لیے کہ وہ واقعات کے درمیان تعلق کو سمجھنے میں مددگار نہیں ہوتے۔ ایسے ہی واقعات کو عرف عام میں غیر متعلق کہا جاتا ہے، مگر فلسفۂ زندگی مرتب کرنے میں کوئی واقعہ غیر متعلق نہیں ہوسکتا۔ اس لیے خواہ کسی فلسفۂ حیات کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، اگر کوئی واقعہ اس میں ضم نہیں ہوسکتا، تو وہ اس کی تنقیص کرتا ہے۔ فلسفی کو خبردار رہنا پڑتا ہے کہ وہ کسی مشاہدے کو نظرانداز نہ کرے اور اسے غیر متعلق نہ سمجھے۔ کسی جزوی ربط کے لیے، جس کا مقصد محدود ہو، بہت سے واقعات و مشاہدات غیر متعلق ہوسکتے ہیں، لیکن اگر مقصدِ حیات کا کلی تصوّر ہو تو پھر کوئی جزو غیر متعلق نہیں ہوسکتا۔ واقعات کی طرح وہ تمام جزوی معتقدات بھی جو فلسفی کے نزدیک صحیح ہوتے ہیں اس کے اساسی فلسفہ کی تشکیل میں مدد دیتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر فلسفی کو پہلے جزوی عقائد کا ادراک ہوتا ہے اور اس کے بعد اس پر اساسی فلسفہ کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔

کسی ایسے مفکر کے لیے جو کسی دین کی حقیقت پر ایمان رکھتا ہو، خواہ یہ ایمان اس کے دل میں تعلیم، تربیت اور ماحول کی وساطت سے اترا ہو، یا اس کی جستجو اور کاوش سے حاصل ہوا ہو، یہ ناگزیر ہے کہ اس دین کی تعلیمات کا اس کے تصورات پر اثر ہو۔ یہ اثر کبھی غیر شعوری ہوتا ہے اور کبھی شعوری، مثلاً بعض فلسفی جو اپنے دین سے بغاوت کرتے ہیں پھر بھی اس کے بہت سے تصوّرات سے آزاد نہیں ہوتے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں، اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ بعض دینی تصوّرات فضا میں ایسے پیوست ہوجاتے ہیں کہ اس میں سانس لینے والا غیر شعوری طور پر انہیں جذب کرلیتا ہے۔ لادینی فلسفیوں کا تو ذکر ہی کیا، بعض ادیان کے بانی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، مثلاً اس برِعظیم میں جب مہابیر اور گوتم بدھ نے ادیان کی بنیاد رکھی تو جین اور بدھ دھرم دونوں کا بنیادی فلسفہ وہی رہا جو ہندوستان میں عرصے سے رائج تھا اور جسے بنیادی طور پر صحیح سمجھا جاتا تھا، یعنی کرم اور تناسخ کے معتقدات جو بدیہات کی طرح تسلیم کیے جاتے تھے۔ دین کے پابند فلسفی کبھی تو کلام کی گتھیوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں، کبھی اپنے دین کی تعبیر و تفسیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور کبھی فلسفہ اور دین میں تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، اور بعض اوقات یہ آخرالذکر کوشش علی الاعلان نہیں ہوتی بلکہ فلسفہ کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے دینی تصوّرات کو ان کا نام لیے بغیر تقویت حاصل ہو۔ اقبال ایک ایسے فلسفی ہیں جو اسلام کی حقانیت پر ایمانِ کلی رکھتے ہیں، اور ان کے تصورات ان کے دینی معتقدات سے نہ صرف ہم آہنگ ہیں بلکہ اقبال ان پر پوری طرح قائم ہیں۔ دین محض ایک فکری پیداوار نہیں ہے۔ دین خواہ عقلِ انسانی سے کتنا ہی مطابق کیوں نہ ہو، دین خواہ کسی فلسفہ کی بنیاد ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس کے سوتے عقل نہیں عقیدے میں پائے جاتے ہیں؛ اس کے چشمے ذہن نہیں قلب میں اُبلتے ہیں؛ اس کی جڑیں افکار نہیں واردات میں ہوتی ہیں۔ دین کا تعلق وجدان سے ہے

منطق و دلیل سے نہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دین حقیقت نہیں ہے، بلکہ وہ اصل حقائق ہے، اس لیے کہ عقل فی الحقیقت مادری ادراکات سے مرکب ہے اور دین کا ادراک ان سے بالاتر اور انا یا خودی کی اس سعی کا نتیجہ ہے جس کے ذریعہ وہ لامکان و لازمان میں داخل ہونا چاہتا ہے۔

لیکن کیا یہ ادراک انسانی کوشش کا پابند ہے یا بے کوشش حاصل ہوتا ہے؟ اگر بے کوشش حاصل ہوتا ہے تو کہاں سے آتا ہے؟ روحانی منازل کے طے کرنے والے اپنی ساعی اور دوسروں کی رہنمائی سے اس ادراک کو قوی تو ضرور کر سکتے ہیں لیکن اس کا حصول پوری طرح ان کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہوتا۔ یہ ادراک ہمارے عقیدہ کے مطابق ابتداءً اللہ تعالیٰ نے ازل سے انسان کی رُوح کو ودیعت کیا ہے اور پھر انبیاءؑ کو بھیج کر اس کی تجدید کی ہے، اور ان کی تعلیم کے ذریعہ سے اعلیٰ قدر سعی و صلاحیت افراد کے دل میں اسے تقویت پہنچائی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب افراد کے ذریعہ سے یہ ادراک معاشرے کے شعور و تحت الشعور میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اس معاشرے کے صغار و کبار کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے اور اس کا بیشتر حصہ وہ قبول کر لیتے ہیں۔ اگر ان کا ذاتی وجدان اس طرف مائل ہوتا ہے تو وہ اپنی صلاحیت کے مطابق اسے عبادت و طاعت سے تقویت پہنچاتے ہیں۔ لیکن اسلام اس راز سے بے خبر نہیں ہے کہ اس ادراک کو معاشرہ میں زندہ رکھنے کے لیے تبلیغ رشد اور ہدایت کی ضرورت ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت کو اس کام میں سرگرم رہنا چاہیئے۔ یہ خدمت اگر وقت کے تقاضوں کے مطابق انجام نہ پائے تو معاشرہ میں غیر اسلامی اثرات کا نفوذ ہو جاتا ہے یا اس کا دینی وجدان کمزور پڑ جاتا ہے۔ اور وہ بے عقیدگی یا بے عملی یا فرار یا ان تینوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس وقت خود اس کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے، اور اگر وہ اس خطرے کا مقابلہ نہ کر سکے تو اپنی امتیازی خصوصیات کو کھو بیٹھتا ہے۔ ایسی حالت میں یا وہ منتشر ہو جاتا ہے اور اس کے افراد دوسرے گروہوں میں جذب ہو جاتے ہیں یا وہ دوسروں کا سیاسی، ذہنی اور روحانی طور پر محکوم ہو جاتا ہے اور اس میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنے انا کو قائم رکھ سکے۔ فی الحقیقت اس کا انا اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت کو ضروری تصور ہی نہیں کرتا۔ ایسے خطرے کے مواقع پر اگر اس انحطاط پذیر معاشرے میں کچھ سکت باقی ہوتی ہے تو وہ ایسے مفکر پیدا کرتا ہے جو اس معاشرے کو خطرات سے آگاہ کر دیں اور اس کے انا کو دوبارہ مضبوط کریں تاکہ وہ خطرات کا مقابلہ کر سکے۔ اس کام میں یہ مفکر خود شعوری یا غیر شعوری طور پر ان عقائد و تصورات کو اپناتے ہیں جن کی مدد سے معاشرہ تعمیر ہوا تھا، یا جنھوں نے معاشرے کو تنازع للبقا میں کمک پہنچائی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ خود ان عقائد پر یقین راسخ نہ رکھتے ہوں تو ان کے دل میں معاشرے کو زندہ رکھنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ کسی نسلی یا جغرافیائی وحدت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو عقائد و مقاصد کی تبدیلی انھیں ناگوار نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ان کا مقصود کسی ایسے معاشرے کا زندہ رکھنا ہے جو عقائد کی بنا پر قائم ہوا ہے تو ان کے لیے ان عقائد کی استواری لازمی ہوتی ہے جو اس معاشرہ کی اساس ہوں۔

مثال کے طور پر اہلِ برطانیہ کے لیے نظری طور پر یہ ممکن ہے کہ وہ مسیحیت کو چھوڑ دیں لیکن ان کی برطانویت قائم رہے۔ اگر ان میں اخلاقی انحطاط پیدا ہو، یا ان کے وہ اوصاف ختم ہوتے نظر آئیں جنھوں نے ان کی قومی عظمت کی تعمیر کی ہے، تو ان کے مصلح کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ خود مسیحی ہی ہو، لیکن اس کا برطانوی ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ان اقدار کی حمایت کر سکے جن کے ماتحت اس کے نزدیک برطانیہ نے ترقی کی تھی۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان اقدار کو فرسودہ اور دور از کار سمجھ کر پسِ پشت ڈال دے اور جدید اقدار کی حمایت کرے، اور پھر بھی وہ برطانیہ کی عظمت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن جو شخص خود کلیسائے انگلستان کے وجود کو قائم رکھنا چاہے گا، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ کلیسا کے بنیادی عقائد پر ایمان رکھتا ہو اور ان کی حمایت کرے۔ اوّل الذکر شخص کو نفسیاتی طور پر برطانیہ اور برطانوی قوم سے محبت ہوگی اور دوسرے کو کلیسائے انگلستان سے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں میں تضاد ہو، لیکن اگر تضاد ہو تو عقیدہ، رجحان اور مقصد کے اعتبار سے ہی ہوگا، اور اگر مؤخر الذکر یہ دیکھے گا کہ برطانیہ سے محبت کلیسائے انگلستان سے محبت کے راستے میں مزاحم ہے تو وہ برطانیہ سے محبت کے خلاف سرگرم پیکار بھی ہو سکتا ہے۔

اقبال کے فلسفے کی بنیاد اسلام پر ایمان ہے۔ یہ ایمان اقبال کے ادراکِ حقیقت پر قائم ہے۔ اس کا کوئی منطقی سبب نہیں ہے۔ اقبال فلسفہ کے راستے سے اسلام تک نہیں پہنچے، اسلام کے راستے سے اپنے فلسفے تک پہنچے۔ اسی لیے یہ فلسفہ اپنی کمال معقولیت کے باوجود بنیادی طور پر وجدانی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس بالغ نظر مسلمان کے نزدیک، جس کی رگوں میں نسل ہا نسل کے برہمنوں کا خون گردش کرتا تھا اور جسے ذہن ہندی کی موشگافیوں کی صلاحیت عطا ہوئی تھی، عقل مجبور ہے، اور قلب حکمت صحیحہ کا مسکن۔ اقبال فرنگی فلسفیوں کے خیالات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ وہ خود مغربی فلسفہ کے عالم تھے، مسلمان فلسفیوں کی بحثوں پر بھی انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی، اور وہ ان تمام فلسفیانہ خیالات کو حسبِ ضرورت اور بعض حدود کے اندر رہ کر دلیل، تنقیح یا استدلال کے لیے استعمال بھی کرتے تھے۔ مگر ان کا تکیہ عقائد اسلام پر تھا اور ان ہی کی کسوٹی پر وہ تمام خیالات کو پرکھتے تھے۔ بالفاظ دیگر اقبال کے فلسفہ کا محور اسلام تھا اور یہ اسلام چونکہ ان کو ایک مسلمان گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے ابتداً غیر شعوری طور سے ملا تھا۔ لہٰذا ان کی نفسیات کا بڑا جزو تھا۔

صرف یہ کہ دینا کافی نہیں ہے کہ ان کے خیالات و تصورات بنیادی طور پر اسلام پر قائم ہیں، اس لیے کہ یہ امر بھی نہایت اہم ہے کہ خود اسلام کے متعلق ان کے تصورات کا منبع کیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ ہر ذی ہوش مسلمان کے دینی عقائد کا سرچشمہ ہیں، لیکن ان کے علاوہ مسلمان مفکرین، شعرا، مصنفین اور تاریخی اہمیت کی حامل شخصیتوں کا بھی اثر عوام و خواص کے فکر پر بہت گہرا پڑتا ہے اور آہستہ آہستہ خیالات کا ایک ذخیرہ ساری قوم کے تحت الشعور میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ خیالات ساری قوم کی نفسیات کا جزو بن جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی، لازم و ملزوم کی طرح، قوم کے تاریخی تجربے بھی ہوتے ہیں جو اس کی نفسیات کا ایک جزو بن جاتے ہیں۔ اس لیے یہ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس برِصغیر کے مسلمانوں

کی نفسیات کی تعمیر میں کن تاریخی محرکات نے حصہ لیا ہے اور ان کے تحت الشعور و شعور کو کس سانچے میں ڈھالا ہے۔

جہاں تک مفکرین کا تعلق ہے۔ میں ان کی تعلیمات کی طرف نہایت اختصار کے ساتھ اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے تصورات مستقل تصانیف کی وسعت کے طالب ہیں اور ان کے متعلق کتابیں موجود بھی ہیں اور ابھی اس کی گنجائش ہے کہ اور کتابیں لکھی جائیں۔ اس اختصار کی ضرورت کے ماتحت افراد کی جگہ بعض گروہوں کی طرف ہی اشارہ ممکن ہوگا، مثلاً اس برعظیم کی نفسیات پر صوفیہ کا بہت اثر پڑا ہے ان خیالات کے علاوہ جو شطحیات کے ذیل میں آتے ہیں اور جن سے خود محتاط اور اہل دل صوفیہ بھی بیزار تھے۔ بہت سے ایسے خیالات و تصورات ہیں۔ جنہوں نے ہماری نفسیات کی تعمیر میں گراں قدر حصہ لیا ہے، مثلاً عشق الٰہی اور حبِ رسولؐ، تزکیۂ نفس، فقر، ایثار اور سود و زیاں سے استغنا کی صفات کی تخلیق و تقویت میں صوفیہ کی تعلیمات کا وقیع حصہ ہے۔ یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ تمام صوفیہ کے مزاج میں فرار کا عنصر غالب تھا، اس لیے کہ مشرقی پاکستان میں صوفیہ نے تبلیغ کے ساتھ ساتھ جہاد بھی کیا اور ایسے اہل دل جو جہاد کی نعمت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے، بہت سے تھے۔ شعراً میں ایسے لوگوں کا شمار ہوتا ہے جیسے حضرت امیر خسرو و حسن سجزی جو ایک طرف معرفت الٰہی میں سرشار تھے تو دوسری طرف شاعری میں یکتائے زمانہ تھے۔ رومی اگرچہ اس برعظیم سے تعلق نہ رکھتے تھے، لیکن ان کی لافانی مثنوی مسجدوں اور خانقاہوں میں یکساں ضوفگن تھی۔ اسی طرح مولانا جامی کی تصانیف سے مدرسہ و خانقاہ میں یکساں استفادہ ہوتا تھا اور غالباً مجموعی طور پر یہ تمام اثرات ہماری نفسیات میں خاص خاص مفکرین کی تعلیمات سے زیادہ رچ گئے تھے، لیکن انفرادی طور پر جن دیدہ وروں کی تعلیمات نے معنی خیز تاثرات پیدا کیے ان کی خصوصی اہمیت کا ذکر بھی اشارتاً ناگزیر ہے۔ تاریخ کے طالب علموں کے علاوہ کم ایسے لوگ ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی کے پیدا کیے ہوئے انقلاب کی عظمت و وسعت سے واقف ہوں۔ ترکی سے انڈونیشیا تک ان کی تعلیمات نے تصوف کو شریعت کا پابند کرنے میں ایسا کارنمایاں انجام دیا ہے کہ شطحیات کا ڈھونڈ ڈھونڈ کر خاتمہ کر دیا اور خانقاہوں کو درستیٔ اعتقاد اور شریعت کا پابند بنا دیا۔ ان ہی کے وجدان میں انا کے وجود اور اس کی اہمیت کا ادراک ہوا اور پھر وہ فلسفیانہ مباحث کا مرکز بنا اور وحدت وجودی اور وحدت شہودی کے متعلق دلائل و براہین سے مدرسوں اور خانقاہوں کی صحبتوں میں گرمی پیدا ہوئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے تاریخ، عمرانیات معاشیات کی سرحدوں کو احیائے اسلام اور ملت کی سبیلوں سے لا ملایا اور حضرت مجدد الف ثانی کی طرح روحانی ادراک اور علوم کے درمیان فاصل دیواروں کو منہدم کیا۔ اگر کسی دل میں یہ شبہ باقی رہ جانے کا احتمال تھا کہ قرب الٰہی کی منازل صرف خانقاہ ہی میں طے ہو سکتی ہیں اور دنیا کے معاملات میں الجھنے سے روح عالم آب و گل میں گرفتار ہو کر رہ جاتی ہے تو سید احمد شہید نے ثابت کر دیا کہ روحانی ترقی کے لیے میدانِ جہاد چلّے کے حجرے سے کم نہیں ہے۔ اگر علما و مدرسین میں اس جذبہ کے پیدا ہونے کا امکان تھا کہ عالم و مدرس کو مدرسہ سے باہر کی دنیا سے کیا واسطہ اور علم کی خدمت دنیا سے دور

ہی رہ کر ہو سکتی ہے، تو حضرت شاہ عبدالعزیز نے ثابت کر دیا کہ بظاہر گوشہ نشین علما و مدرسین بھی ایسی تحریکوں کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں اور پھر انھیں پروان چڑھا سکتے ہیں جو بنگال کے کاشتکاروں کو سرحد کے پہاڑوں میں سرگرم کارزار کر دے۔ اگر غلامی کی ذلت و نکبت نے بعض دلوں کو مُردہ کر دیا اور ملت کی عظمت کی داستان بھلا دی تو حالی کے مسدس نے خوابیدہ حسرتوں کو پھر بیدار کر دیا۔ غرض ہماری تاریخ کا کوئی عہد زیادہ عرصے کے لیے ایسے اہلِ کمال سے خالی نہیں رہا۔ جنہوں نے ملت کے صحیح احساسات کو نشو و نما دی۔

ان افراد اور گروہوں کی کاوش کا یہ نتیجہ تھا کہ ہماری ملی تاریخ سربلندی و ناکامی، کامرانی و نکبت، رجا و قنوط، غرض ہر حال میں ایک سعیٔ پیہم کی داستان ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ اقبال کی تفسیر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری نفسیات اس تاریخ کی پیداوار ہے اور فلسفۂ اقبال کے وجدانی و نفسیاتی منابع کی تلاش کے سلسلے میں اس طرف زیادہ توجہ ضروری ہے، مگر یہ مختصر مقالہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ برِعظیم ہند و پاکستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے تمام وہ پہلو معرضِ بحث میں لائے جائیں جو ہماری قومی نفسیات کو بنانے میں ایک دوسرے کے معاون ہوئے ہیں اور صرف بعض اہم امور کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرنا ناگزیر ہے۔

ہماری ملت کی ابتدا بحرِ عرب اور خلیج بنگال کے ان ساحلی مقامات پر ہوئی جہاں بعثت رسول صلعم سے قبل عرب تاجر آباد تھے۔ ان عربوں کو بعض حقوق حاصل تھے جن میں سب سے زیادہ اہم اپنے طریقہ پر اپنے معبودوں کی پرستش اور اپنی قومی رسوم کی پابندی تھی اسی لیے ان کے ایک سربراہ کو سرکاری حیثیت حاصل ہوتی تھی اور وہ اپنے تنازعات کا فیصلہ بھی اپنے طور پر ہی کر لیا کرتے تھے۔ جب عرب میں اسلام کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی تو تھوڑے سے عرصے میں ہندوستان کے ساحلی مقامات کی عرب آبادیاں بھی مسلمان ہو گئیں۔ اب چونکہ ان میں تبلیغ کا جذبہ بھی پیدا ہوا تو انھوں نے مقامی لوگوں کو مسلمان کرنا شروع کیا۔ دوسری طرف ہندو حکمرانوں کی طرف سے بھی اس کی مزاحمت نہیں ہوئی، لیکن مقامی آبادی کو بعض اوقات اپنے اہلِ قوم کا تبدیلِ مذہب پسند نہ آتا اور مسلمانوں پر زیادتی بھی کر بیٹھتے۔ مگر چونکہ یہ عرب بیرونی ممالک سے تجارت کا واحد ذریعہ تھے اور ان کے چلے جانے سے ریاست کی مالیات کو نقصان پہنچتا، لہٰذا ان کی حفاظت حکومتیں کرتی تھیں۔ پھر بھی مسلمان آبادیوں کو خطرے کا احساس ضرور رہتا تھا۔ اسلام کی اخوت کی تعلیم کے ماتحت تمام نومسلم مسلمان جماعت میں شریک ہو جاتے تھے، اور ہر خطرے کے مقابلے میں متحد ہوتے تھے اور ہندو بھی عرب و غیر عرب میں تمیز نہیں کرتے تھے اور ساری مسلمان آبادی کو ایک ہی سمجھتے تھے۔ یہاں سے عرب و غیر عرب مسلمانوں کے درمیان تفریق مٹنے کا سلسلہ شروع ہوا، اس لیے کہ اگرچہ کچھ عرصہ تک کفو و غیر کفو اور انساب کی وجہ سے آپس کے امتیازات قائم رہے، لیکن جہاں تک غیر مسلم و مسلم کی تفریق تھی وہ ان معمولی امتیازات پر حاوی رہی خوش حالی و اطمینان، یا خطرہ اور مصیبت میں یکساں شرکت کی وجہ سے جو ہم خیالی اور ہم آہنگی پیدا ہوئی، اس سے جہاں

تک اجتماعی مفاد کا تعلق تھا ایک قومیت کی بنیاد پڑی اور اس قومیت کا انحصار کلیتہً اسلام پر تھا، عربیت پر نہ تھا۔ بہت عرصہ تک ان مسلمان آبادیوں میں تین گروہ پائے جاتے تھے — ایک وہ جو خالص عرب تھے، دوسرے وہ جو عرب باپوں اور ہندی ماؤں کی اولاد تھے اور تیسرے خالص ہندی نژاد مسلمان۔ ان تین گروہوں کے علاوہ بعض ایرانی النسل عناصر بھی تھے، مگر ان کی داخلی تنظیم، احکامِ شریعت کے سب پر یکساں نفاذ، اور ان سب کے قاضی اور امیر کے ماتحت ہونے نے ان کو ایک سیاسی، دینی اور معاشرتی وحدت میں منسلک کر دیا تھا اور خود ہندوؤں کی سیاسی اور سماجی حکمتِ عملی نے انھیں علیحدہ رکھا۔ ایکطرف تو ان کا آپس میں رشتہ مضبوط ہوتا چلا گیا اور دوسری طرف ان کی ہندوؤں سے مغائرت قائم رہی، یہاں تک کہ ان ہی وجوہ کی بنا پر وہ ہندو جو مشرف بہ اسلام ہوتے تھے۔ اپنے ہم نسلوں سے علیحدہ ہو کر اسلامی معاشرے کے فرد بن جاتے تھے۔

اس برعظیم میں اسلامی معاشرہ کی بنا جن اصولوں پر پڑی تھی وہ بعد میں بھی قائم رہے۔ جب عربوں نے سندھ فتح کیا اور عرب شہر قائم کیے تو ان میں حسبِ دستور مساجد و مدارس کا انتظام کیا، قضاۃ کا تقرر کیا، اور اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی شعار کے قیام کے لیے جملہ تدابیر اختیار کیں۔ محمد بن قاسم کی فتوحات کے ساتھ ساتھ ہم جوق جوق بدھوں کے اسلام میں داخل ہونے کا ذکر پڑھتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ انتظامات عرب و سندھی مسلمانوں کے لیے یکساں کیے گئے ہوں گے۔ اور یہ امر بھی قرینِ قیاس ہے کہ عرب شہروں میں بہت سے سندھی مسلمان ان سہولتوں کی وجہ سے کھنچ کر آ گئے ہوں گے اور ایسا بھی ہوا ہو گا کہ اگر کسی جگہ کثرت سے بدھ یا ہندو مسلمان ہوئے ہوں اور وہاں مسلمانوں کی معتد بہ آبادی ہو تو انھیں اسلام کی تعلیم اور شریعت سے وابستہ رکھنے کے لیے اسی قسم کے انتظام کیے گئے ہوں گے جو عرب شہروں میں کیے گئے تھے اور اس طرح اسلامی معاشرے کے متحد و منفرد ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو گا۔ افسوس کہ ہمارے پاس اتنا مواد نہیں ہے کہ ہم عرب آبادیوں کی طرح ملی جلی آبادیوں کے متعلق بھی حتمی رائے کا اظہار کر سکیں، لیکن ہندوؤں کی معاشرت اور مذہبی خیالات، نیز اسلام کے سیاسی و سماجی نظام و نظریات سے توقع اسی امر کی ہے کہ آبادی کی تقسیم عرب و غیر عرب کی جگہ مسلم و غیر مسلم کی تفریق پر قائم ہونے میں زیادہ عرصہ نہ لگا ہو گا — یہ کہ یہ خیال قرینِ حقیقت ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اسماعیلی مبلغین کی کوشش سے سندھ کی امارتیں اسماعیلیوں کے ہاتھ میں آ گئیں اور آہستہ آہستہ اسماعیلیت کو فروغ ہوا تو یہاں پر ہندی النسل اسماعیلی مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور بہت عرصے تک قائم رہی۔ سمرہ خاندان تین سو سال تک حکمران رہا اور آخری زمانے میں اس نے تسنن اختیار کیا۔ اس کے بعد سمہ بھی ہندی النسل تھے، جس سے مسلمان معاشرے میں ہندی النسل طبقوں کے نفوذ کا پتہ چلتا ہے۔ سمرہ کے عربی النسل ہونے کی روایت کو میں تسلیم نہیں کرتا ہوں۔ اس کا مفصل ذکر میں نے اپنی تصنیف :-

The Muslim Community of the Indo-Pakistan Sub-continent

میں کیا ہے۔

ترکوں کی فتح کے بعد تو تاریخ کے خدوخال زیادہ روشن ہوجاتے ہیں۔ خصوصاً تیرھویں صدی عیسوی میں جب اس طویل وعریض برِعظیم کا تمام شمالی حصّہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا تو تاریخ کا ایک جدید باب شروع ہوا۔ اس دور کے بلند اقبال و عالی ہمّت مسلمانوں کے سامنے بظاہر ایسے مسائل تھے جو ان سے کم حوصلہ اور تدبر رکھنے والے ہرگز حل نہ کرسکتے تھے۔ اٹک سے بنگالہ کی مشرقی حدود تک کے فاصلہ پر نظر ڈالیے۔ پہلے تو اس کی وسعت ہی کمزور دلوں میں مایوسی پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ آخر اس وسعت کو دیکھ کر ہی تو دنیا کے مشہور فاتح سکندرِ اعظم نے واپسی کا ارادہ کرلیا تھا۔ پھر اس علاقہ کے ان جغرافیائی حالات کا جائزہ لیجیے جو تیرھویں صدی عیسوی میں پائے جاتے تھے۔ موجودہ اترپردیش، بہار اور بنگال میں ایسے گھنے جنگل تھے جہاں سے گزرنا دشوار تھا۔ برسات میں دریا ناقابلِ عبور ہوجاتے تھے اور بہت سے علاقوں میں سیلاب نقل و حرکت میں مزاحم ہوتے تھے۔ اول تو ان علاقوں کا فتح کرنا ہی ان قلیل التعداد افواج کے لیے جو حملہ آور ہوئیں آسان نہ تھا، پھر ان کو قبضہ میں رکھنا، وسائل آمد و رفت کو کھلا رکھنا، اور مقامی بغاوتوں کو فرو کرنا تو بظاہر ناممکن نظر آتا ہوگا۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ ابھی سلطنت پوری طرح جمنے بھی نہ پائی تھی کہ غیر مسلم مغلوں کا ایک طوفان اُٹھا جس نے تمام مشرقی بلادِ اسلام پر خون و غارت کی آگ برسادی۔ اس کا سو سال تک مقابلہ کرنا اور برِعظیم میں داخل ہونے سے روکے رکھنا بظاہر ایک فوق العادۃ کارنامہ معلوم ہوتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ فتوحات کا جاری رکھنا اور اقصائے جنوب ہند تک پرچمِ اسلام کو جاکر نصب کرنا تو اور بھی محیر العقول ہے اور یہ فتوحات، جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں ہوئیں جو وحشی ہوتی یا آدابِ حرب سے نابلد ہوتی یا جسے جان دینا نہ آتا ہوتا۔ اسی قوم کے تو افراد تھے جو مغلوب ہوکر اطاعت کرنے کی بجائے زعفرانی کپڑے پہن کر پہلے اپنی عورتوں کو جلا دیتے تھے اور پھر میدان میں آکر اپنی جان بہت مہنگی بیچتے تھے۔ اس دور کی تاریخ کے اور بھی زرّیں پہلو ہیں جن کے ذکر کا یہاں موقعہ نہیں ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ بعض ان نفسیاتی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جائے جو اس دور کی پیداوار تھیں اور جو اب تک ہمارے تحت الشعور میں پورے استحکام کے ساتھ قائم ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ قلت تعداد کا ہی معاملہ لیجیے۔ اس برِعظیم کے مسلمان اپنا وجود اور استیلا کو قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ اس کے خواہش مند رہے کہ دوسرے ممالک کے مسلمان ترکِ وطن کرکے ان میں شامل ہوں، اور اس طرح ان کی مشکلات و کامرانیوں میں ان کے شریک بنیں۔ چونکہ انھیں اپنی تعداد بڑھانے کی ضرورت لاحق تھی، اور اس کے بغیر ان کے نفوذ و اثر میں ترقی ممکن نہیں تھی، لہٰذا وہ ہر باہر سے آنے والے مسلمان کو گلے سے لگاتے تھے اور ان کے سلاطین اس کی قابلیت کے اندازے سے اسے خدمات تفویض کرتے تھے۔ ان کے ہاں قابلیت ہی وہ کسوٹی تھی جس پر پورا اُترنے کے بعد ترقی کی راہیں کھل جاتی تھیں، اور ایسا تو کوئی بھی نہیں ہوتا تھا جو بے کار رہے اور کسی نہ کسی خدمت پر مامور نہ کیا جائے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ خود ہی اپنے لیے کوئی کام تلاش کرلے اور اس میں

منہمک ہوجاتے۔ اس پر بھی اس کی طبیعت کی افتاد اور اس کی رضامندی کے مطابق اسے پوری امداد دی جاتی تھی۔ ان آنے والوں میں اکثر افراد وسط ایشیا کے ہوتے تھے، لیکن دوسرے اسلامی ممالک سے بھی لوگ آتے تھے اور اس برعظیم میں آکر اگر اپنے اصلی وطن کی یاد ان کے دل میں زندہ بھی رہتی تھی تو ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے، ورنہ یہاں تو وہ صرف مسلمان ہی کہلاتے تھے اور صرف مسلمان ہی کی حیثیت سے ان کے حقوق و فرائض متعین ہوتے تھے۔
یہی حال ان جماعتوں اور افراد کا تھا جو اس برعظیم میں اسلام قبول کر کے مسلمانوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ وہ بھی یہاں کے اسلامی معاشرے کا جزو بن کر اپنے پرانے تعلقات منقطع کر لیتے تھے اور دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داریوں میں شریک ہو جاتے تھے، اور جو مواقع دوسرے مسلمانوں کو حاصل تھے وہ انھیں حاصل ہو جاتے تھے۔ اس لیے اس برعظیم میں مسلمانوں کی وحدت کا واحد عامل اسلام تھا، اور اسلام ہی سے ان جذبات کی تعمیر ہوتی تھی جو ان کے اجتماعی ادراک کی تہ میں کارفرما ہوتے تھے۔ اس میں ترکی و ایرانی، ہندی و عرب، کالے اور گورے کی تمیز نہ تھی بلکہ پوری قوم اخوتِ اسلام کی حلقہ بگوش تھی اور اجتماعی نفسیات کی بنیاد اس پر قائم تھی۔
مغول حملہ آوروں کی تباہ کاریوں کے سبب سلطنت دہلی کے باہر مسلمانوں کی لاتعداد بستیاں ویران ہوئیں۔ بغداد کی نالیوں میں خون بہنے اور دجلے کا پانی سُرخ ہونے سے پہلے اور بھی شہروں اور قصبوں کی زمین سُرخ ہو چکی تھی۔ مساجد، مدارس، کتب خانے، وسائلِ آب پاشی، مکان، بازار، کاروان سرائے، غرض تمدن و معیشت کے ذرائع کی تباہی کی داستان اگر دہرائی جائے، تو صدیاں گزرنے کے بعد بھی حساس آنکھیں خون کے آنسو روئیں۔ اس تباہی کے عواقب میں مسلمانوں کی علمی ترقی کے انسداد کا سانحہ بھی شامل ہے، مگر اس وقت میرا ارادہ اس المناک داستان کو بیان کرنا نہیں ہے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت کے علمائے و فضلائے اور اکابر میں جو بچ نکلے اور جن کی قسمت مساعد تھی، ان میں سے اکثر و بیشتر دہلی آکر پناہ گزین ہوئے، حتّٰی کہ بلبن کے عہد میں بھی اس شہر میں محلے کے محلے ان مہاجرین کے نام سے آباد ہوئے اور ان کے دم سے علم و فن کے وہ چشمے اُبلے جنھوں نے روحانی طور پر بھی دہلی کو عروس البلاد اور قبۃ الاسلام بنا دیا۔ مسلمان مؤرخین اور مصنفین نے دہلی کے حالات جو قلم بند کیے ہیں انھیں پڑھ کر ہمیشہ یہ حیرت پیدا ہوتی ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں اس شہر نے علم و فن میں یہ ترقی کیونکر حاصل کر لی، لیکن برنی کے وہ صفحات پڑھ کر جہاں اس نے ان مہاجرین کا ذکر کیا ہے، یہ حیرت دُور ہو جاتی ہے۔ یہی تو وہ روشن ستارے تھے جن کی ضو پاشیوں سے اول اول یہ برعظیم منور ہوا۔ اس سے پہلے لاہور کو یہ شرف حاصل ہو چکا تھا کہ اسلامی علوم کی تاریخ میں اس کا نام سربلند ہو۔ اس کا سبب غزنویوں کا ترک وطن کر کے اس شہر کو اپنا دارالسلطنت بنانا تھا اور سلطان محمود کی قائم کردہ روایات چونکہ انحطاط کے دور میں بھی قائم رہیں۔ لہٰذا لاہور بھی مشہور اسلامی شہروں کی فہرست میں داخل ہوا۔ بعد میں اور صوبائی حکمرانوں کے دارالسلطنت بھی علم و فضل کی خدمت کے لیے مشہور ہوئے۔ علوم منقول تو بین الاسلامی

تھے ہی، اس لیے کہ قرآن و حدیث و فقہ کا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں ہے، اور معقولات کا بھی یہی حال تھا، اس لیے کہ وہ مسلمانوں کی روایات کی حامل تھیں لیکن شاعری نے بھی اپنا وسط ایشیائی اور ایرانی مذاق نہ بدلا اور اس کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ اس کی بنیاد باہر سے آنے والوں کے ہاتھوں رکھی گئی تھی اور چونکہ آنے والوں کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا، کبھی اس کی روایات میں فرق نہ آیا اور خیالات و اندازِ بیان میں وہ برابر مستولی رہی، یہاں تک کہ جب شعرا نے فارسی چھوڑ کر اردو اختیار کی تو انھوں نے صرف زبان ہی کے بدلنے پر اکتفا کیا اور خیالات و استعارات و تشبیہات یہاں تک کہ عروض و اصناف کو بھی بغیر ادنیٰ تبدیلی کے قائم رکھا۔ مراد یہ ہے کہ علوم و شاعری کے ذریعہ جن نفسیات کی تعمیر ہوئی، وہ اسلامی تھی۔ مقامی نہ تھی۔ یہی سبب تو ہے کہ ہم اب تک شمشاد و صنوبر اور گل و بلبل کا ذکر کرتے ہیں، لیکن راوی اور چناب، گنگا اور جمنا کے کنارے پیدا ہونے والے درخت ہماری توجہ کا مرکز نہیں بنے۔ لالہ زار ہمیں یاد رہے، لیکن گیہوں اور دھان کے لہلہاتے کھیت ہمارے شاعرانہ جذبات کو ابھارنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ میدان میں رہنے کے باوجود کوہ و دمن کا تصور ہمارے دلوں سے مردہ نہیں ہوا۔ ایسے علاقوں میں آباد ہے جہاں موسم بہار کا وجود عدم سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں ہے، برسات کی طرف شاید ہم اپنے ذوق مے خواری کے سبب ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال لیں، لیکن ہمارے قلب کی حرکت بہمن و دے کا عمل اُٹھنے کے بعد ہی تیز ہوتی ہے، حالانکہ ان کی چیرہ دستیاں ہمارے ماحول میں قابلِ التفات بھی نہیں ہوتیں۔ کوئل کی کو کو اور پپیہے کی پی کہاں کبھی شاید ہمارے کانوں تک پہنچ جائے، لیکن حقیقت میں جب ہمارے خیالی کوہ و دمن ہمارے تصورات کے چراغِ لالہ سے روشن ہوتے ہیں تو ہمارے خوابوں کا مرغ چمن ہمیں نالوں پر اکسا دیتا ہے اور ہم بے قرار ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے نہیں کہ ہم اپنے ماحول سے بے خبر ہیں — اس ماحول کا تو ہمارے حواس پر آغوشِ مادر سے آغوشِ لحد تک برابر نقش بیٹھتا رہتا ہے — بلکہ اس باعث کہ گو صدیوں تک ہمارے جسم اس خطہ میں رہے ہیں جسے برعظیم ہند و پاکستان کہا جاتا ہے لیکن ہمارے دماغ اور ہماری روحیں اس دنیا کی مکین رہی ہیں جہاں پہلے مسلمان آکر آباد ہوتے رہے اور جو اپنے خیالات و تصورات میں ہندی النسل مسلمانوں کو بھی شریک کرتے رہے۔ اس کا ایک اور نفسیاتی سبب بھی تھا جس کی طرف کسی قدر تفصیل کے ساتھ اشارہ ضروری ہے۔

آپ ابتدائے اسلام کی قلیل التعداد ساحلی مسلمان آبادیوں کو لیں یا فتوحات اسلام کے دور کو لیں، جب قلیل التعداد مسلمان انسانوں کے ایک انبوہ غفیر پر حکمران تھے، یا مسلمانوں کے انحطاط کے زمانہ کو لیں جب اس برعظیم کے اکثر حصہ میں وہ ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے دفاع میں چوکنے رہیں۔ ان کے لیے اکثریت کی طرف سے حملے یا بغاوت کا امکان محض تخیل نہ تھا بلکہ انھیں اس سے اکثر دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس عظیم خطۂ ارض پر حکومت کرنے کے لیے یہ تھوڑی سی تعداد قلعہ بند قصبوں میں پھیلی ہوئی تھی

اوران قصبوں کے مسلمانوں پر نہ صرف اپنے دفاع کا فرض عائد ہوتا تھا بلکہ وقتِ ضرورت دوسرے قصبوں اور آبادیوں کی امداد، بغاوت فرو کرنا، وسائل آمد و رفت کو کھلا رکھنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ دوسری جگہ سے امداد آتے آتے دیر لگتی تھی۔ اصل قوتِ دفاع ان ہی کو پیدا کرنی پڑتی تھی اور تسلط قائم ہونے سے پہلے تو اکثر ان آبادیوں کی جان پر بن جاتی تھی۔ اس وقت دفاع میں صرف مسلم و غیر مسلم کی تفریق ہوتی تھی اور خطرے کے وقت کوئی داخلی امتیاز قابلِ اعتنا نہ ہوتا تھا۔ اس طرح ماحول اور غیر مسلموں کی طرف سے خطرہ کا احساس ان کی سرشت میں داخل ہوگیا اور ان کی نفسیات کا بہت بڑا جزو بن گیا۔

قصبوں سے ہٹ کر خطرہ کا احساس ملی سطح پر بھی تھا۔ ہر اقلیت جب ایک بہت بڑی اکثریت پر حکمران ہوتی ہے تو اسے یہ اندیشہ رہتا ہے کہ بغاوت کے ذریعہ سے اس کا تختہ الٹا جا سکتا ہے، خصوصاً جب محکوم قوم ثقافت، علم، آداب حرب اور شجاعت سے خالی نہ ہو۔ اکبر کی ہندو نوازی اور عالمگیر کی اصول اسلام کی پابندی کا سیاسی سبب ایک ہی تھا کہ محکوم قوم اتنی بڑی اکثریت تھی۔ اکبر ان محکوموں کو حکومت میں دخیل اور طاقت میں شریک کرنا چاہتا تھا، اور عالمگیر کی یہ خواہش تھی کہ مسلمانوں کا جذبۂ اسلام کمزور نہ پڑنے پائے تاکہ ان کی دفاعی قوت زائل نہ ہو جائے۔ یہ فکر خود قومی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہے اور حکمران قوم میں یگانگت پیدا کرتی ہے، خواہ یہ فکر شعوری ہو یا تحت الشعور میں۔ اور جب یہ فکر دماغوں سے جاتی رہتی ہے تو قومی یگانگت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب تک خطرے کا احساس شدید رہا تو مسلمانوں میں واقعی خلفشار پیدا نہیں ہوا اور جب تسلط پوری طرح قائم ہوگیا اور بظاہر ایسا ہوا کہ خطرہ نہیں ہے مسلمانوں کی قوت منتشر ہوگئی اور سلطنت میں ضعف پیدا ہوگیا، لیکن خواہ یہ اتحاد موجود ہوتا یا خلفشار کو اپنی جگہ دیتا، دونوں حالات میں نظری طور پر اس اتحاد کی ضرورت ذہنوں میں مرتسم رہتی اور اس اتحاد کی ضرورت کے پس پردہ وہی خیال تھا کہ اقلیت کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے حکومت کی ضرورت ہے اور حکومت کے لیے خطروں سے عہدہ برآ ہونے کی، جو اتحاد اور مستعدی کے بغیر ناممکن تھا۔

یہ تو ایک سیاسی خطرہ تھا۔ اگرچہ اسلام مسلمانوں کے لیے غلامی کی زندگی کو پسند نہیں کرتا، حتیٰ کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کرتا کہ مسلمان غلام رہ کر زندہ رہ سکتے ہیں، تاہم قومیں اور اقلیتیں محکومی کی حالت میں بھی بسا اوقات زندہ رہ جاتی ہیں، اگرچہ ان کے ذہن اور کردار پر اس کا اثر سم قاتل سے کم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مادی وجود اور نفسیات کے بعض اجزا کو محفوظ کر لیتی ہیں۔ اس برعظیم میں مسلمانوں کو ایک اور خطرہ کا مقابلہ تھا جو نہ صرف محکومیت کی حالت میں ان کے وجود کو ختم کر سکتا تھا، بلکہ حاکمیت کے دور میں بھی اس کی طرف سے دفاع لازمی تھا۔ وہ خطرہ تھا اس علاقے کے فلسفہ، نظریۂ حیات، طریقۂ زندگی، معتقدات و افکار اور رسم و رواج کا تدریجی نفوذ، جو بالآخر مسلمانوں کو یہاں کی آبادی کے بحرِ ذخار میں غرق کر دیتا اور وہ اپنی انفرادیت، اپنی ثقافت، اپنا ایمان، اپنا دین اور اپنی روایات بالکل کھو

بیٹھتے۔ یہ خطرہ ہندوؤں کے ساتھ رہنے میں اور بھی شدید تھا، اس لیے کہ ہندو ذہنیت میں دوسری اقوام کو جذب کرنے کی بڑی قوت ہے اور تاریخ کی پوری پہنائی میں یہ قوت کارگر رہی ہے۔ اسلام کو جذب کرنے کی تو ہندو ذہنیت نے بڑی کوشش کی اگر مسلمانوں کی نفسیات کچھ اور ہوتی تو وہ کبھی کے جذب ہو چکے ہوتے اور شاید تاریخ کے اوراق میں ہی ان کا ذکر ملتا ہے۔ شاید ایسا بھی نہ ہوتا، اس لیے کہ ہندوؤں کو تاریخ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ ہندو ذہنیت کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ پہلے تو معتقدات کو چھوڑ کر سماجی اثرات کام میں لاتی ہے۔ انسان کچھ بھی عقیدہ رکھے، لیکن اگر وہ ہندو معاشرتی نظام کو قبول کرلے تو آہستہ آہستہ اس میں پیوست ہو جاتا ہے اور چونکہ ہندو ذہنیت کے بنیادی عقائد یعنی کرم، تناسخ وغیرہ ماحول میں رچے ہوئے ہیں، لہٰذا معتقدات بھی رفتہ رفتہ بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں سے پہلے کتنے ہی گروہ اس برِعظیم میں داخل ہوئے اور یہاں کی آبادی کا ایسا جزو بن گئے کہ ان کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ مسلمانوں کی سخت جانی کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ صدیوں میں مسلمانوں پر یہ وار کارگر نہ ہوا جس کا سبب ان کا ایمان، ان کی شریعت اور اپنے طریقِ زندگی پر ان کا فخر تھا۔ اس کے مقابلے میں انھوں نے جب تبلیغی حربے استعمال کیے تو ہندو ذہنیت کو اپنے دفاع کی سوجھی اور اگرچہ یہ تمام جنگ بسا اوقات غیر شعوری سطح پر دونوں قوموں کی نفسیات کے تحت ہوئی، لیکن اس سے اس جنگ کی شدت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اسلام نے شرک کے مقابلے میں توحید، بت پرستی کے مقابلے میں افراد و اصنام کے مظہر ایزدی ہونے کا عدم احتمال، معاشرہ کے ذات پات اور اعلیٰ ادنیٰ میں تقسیم ہونے کی بجائے مساوات و اتحاد اور ایک ایسے فلسفہ کے مقابلہ میں جو تخیلات کی افراط سے کسی نظام کی پابندیاں بھول چکا تھا۔ اسلامی شریعت کی منطق و تنظیم کو پیش کیا، اور ابتداً ایسا معلوم ہوا کہ اس حربے کا ہندو ذہنیت کے پاس کوئی دفاع نہیں ہے، لیکن بہت جلد ہندو ذہنیت نے اپنا دفاع پیدا کر لیا اور اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ادیان کا اختلاف بے معنی ہے، تمام راستے خدا کی طرف لے جاتے ہیں، ذاتی تزکیۂ نفس اور خدا کی محبت اصل دین ہے، یہ ہر دین میں رہ کر حاصل ہو سکتے ہیں، ہندو اور مسلمان کی تفریق غیر اہم ہے، اور اگر اہمیت کسی چیز کو ہے تو وہ عشقِ الٰہی کو ہے۔ چونکہ بت پرستی، شرک اور عدم مساوات کے اعتراض پھر بھی کھٹکتے رہے اس لیے بہت سے ہندو بزرگوں نے بھی ان سے انکار کیا اور کہا کہ توحید برحق ہے اور ذات پات کی تفریق غلط ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلام میں جذب ہونا پسند نہ کیا بلکہ ان خیالات کی ترویج سے خود مسلمانوں میں ایسے افراد اور فرقے پیدا ہو گئے جو مسلمانوں کے جداگانہ وجود اور اسلام اور ہندو ذہنیت میں تفریق کے قائل نہ رہے۔ اس گروہ میں اپنی سیاسی اہمیت کے سبب اکبر اور داراشکوہ زیادہ مشہور ہیں، مگر اس قسم کے دوسرے افراد کی بھی کمی نہ تھی۔

اس مہلک فلسفے کے منطقی لواحق پر غور کیا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ اگر تمام ادیان برابر ہیں اور انسان کو ایک ہی منزل کی طرف لے جاتے ہیں، تو اسلام کا ایک امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور ہدایت و ضلالت کے تصورات

ہی بدل جاتے ہیں اور اگر اسلام اور دیگر ادیان میں کوئی فرق نہ ہو تو امتِ مسلمہ کا وجود کلمۃ الحق کے لیے ضروری نہیں رہتا اور اگر امت مسلمہ کے وجود کی ضرورت نہ ہو تو پھر اس برِعظیم کے سوادِ اعظم میں اس کا جذب ہو جانا مسلمانوں کے لیے ناقابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ الغرض مسلمانوں کا بھی وہی حشر ہوتا جو اور آنے والوں کا ہوا ہے۔ یہ فلسفہ نہ تھا بلکہ ایک ایک ایسا زہر تھا جو پہلے حواس کو معطل کر دے اور پھر سلسلۂ حیات کو ختم کر دے۔ چونکہ اس فلسفہ کو ویدانت اور تصوّف کی سطحی یکسانیت کے سبب صوفیہ کی اصطلاح میں بیان کیا جاتا تھا اس لیے مسلمان اور بھی آسانی کے ساتھ اس کا ہدف بن سکتے تھے۔ اسی کا علاج کرنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی نے وحدت الوجود و وحدت الشہود کے نکات سمجھائے اور احیائے شریعت کی تحریک چلائی۔

ہندویت میں جذب ہو جانے اور اپنا وجود کھو بیٹھنے کا خطرہ، خواہ سیاسی بے چارگی کی وجہ سے ہوتا نظر آتا یا عقائد میں باطل تصوّرات کے نفوذ سے، یکساں تشویش کا باعث تھا، اور چونکہ ملت اپنے وجود کو عزیز رکھتی تھی۔ لہٰذا شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کی حفاظت کو ضروری سمجھتی تھی۔ یہاں اس استعجاب کا اظہار اگرچہ موضوع سے ہٹا ہوا ہے، تاہم کلیتاً بے محل نہیں ہے کہ جب مغرب سے ایسے ہی فساد کی یورش ہے تو ہماری تمام دفاعی قوتیں خوابیدہ ہیں اور ہماری غیر شعوری مدافعت بھی بروئے کار نہیں آتی اور احساسِ کمتری نے ہم پر ایسا غلبہ پایا ہے کہ مغرب کے ساتھ انضمام کو ہم ترقی اور زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہرحال یہ لاپروائی ہم میں اس زمانے میں جس کا مَیں ذکر کر رہا ہوں نہیں پائی جاتی تھی اور خواہ حالات کیسے ہی ناسازگار رہے ہوں۔ ہماری قوتِ دفاع مفلوج نہیں ہوئی تھی۔

چونکہ ہمیں اپنا وجود برقرار رکھنا تھا لہٰذا قلت تعداد سے جو احساسِ ضعف پیدا ہوتا تھا، اسے دُور کرنے کے لیے روحانی و نفسیاتی طاقت کے سوتے تلاش کرنے ناگزیر تھے۔ ہماری سب سے بڑی قوت تو ہمارے ایمان میں مضمر تھی، اس لیے کہ اس کی بدولت ہمیں یہ یقین میسّر تھا کہ ہمارا وجود لازوال ہے۔ ہمارے نزدیک جس قوم کے سینوں میں توحید کی امانت محفوظ تھی اس کا نام و نشان مٹانا آسان نہ تھا، اور چونکہ ہم حق کے امین تھے اس لیے ہماری قوم اور ان اقوام میں جن کے سپرد یہ امانت نہ تھی ہمارے نزدیک زمین آسمان کا فرق تھا مگر اس یقینِ محکم کے ساتھ ہم نے اور بھی وسائل اختیار کیے، خواہ یہ اس سبب سے حاصل کیے ہوں کہ ہماری ثقافت کی جڑیں اس برعظیم سے باہر اسلامی دنیا میں پیوست تھیں، یا اس وجہ سے کہ اس سے قلّت تعداد کا نفسیاتی اندیشہ کچھ کمزور پڑ جاتا تھا۔ یا پھر اس باعث کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری بڑھتی ہوئی طاقت کے قیام میں باہر سے آنے والے مسلمانوں کا بھی حصّہ تھا اور جب تک اولوالعزمی قائم رہی ہم نے ان کی ضرورت محسوس کی اور جب انحطاط نے اس اولوالعزمی کو کمزور کر دیا تو ہم ایرانی و تورانی، شیعہ و سنی اور ملکی و غیر ملکی کے جھگڑوں میں پڑ گئے جس کی ہمیں قرار واقعی سزا بھی بھگتنی پڑی لیکن اولوالعزمی

کے زمانے میں جب ہماری دفاعی قوتیں بروئے کار تھیں، ہماری طاقت کے سرچشموں میں عالمِ اسلام کی طاقت اور اُمّتِ مسلمہ کے وطن کی وسعت بھی تھی۔ روحانی طور پر ہم ایک بہت بڑی دنیا کا حصّہ تھے۔ وہ بڑی دنیا ہماری پشت پر تھی۔ جب کبھی ہم کمزور پڑے تو اس دنیا نے پھر کوشش کر کے ہمیں سربلند بنایا اور پہلے سے زیادہ طاقت بہم پہنچائی۔ عربوں کی حکومت جب سندھ میں ختم ہوئی تو ترک پنجاب پر قابض ہوئے۔ جب غزنوی کمزور پڑے تو غوریوں کی سرکردگی میں ایک نئی اور کہیں زیادہ وسیع سلطنت کی بنیاد پڑی۔ جب اس میں اضمحلال پیدا ہوا تو افغانوں نے اپنے پہاڑوں سے نکل کر زمامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور جب وہ آپس کے اختلافات سے ہماری قیادت کے قابل نہ رہے تو سلطنتِ مغلیہ نہایت طمطراق کے ساتھ قائم ہوئی۔ جب اس طرح اسلام اور مسلمانوں کے تفوق کو قائم رکھنے کے لیے باہر سے کمک پہنچتی رہی تو پھر یہ خیال کیا غلط تھا کہ ہم دراصل ایک بڑی اُمّت کا ہراول ہیں جو برعظیم ہندو پاکستان کو اپنی گرفت سے نہ نکلنے دے گی، اور چونکہ ہم اس کے سپاہی ہیں وہ ہمیں مغلوب نہ ہونے دے گی۔ یہی سبب تو ہے کہ جب ہم مجبور ہوئے تو ہمارے مفکر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے احمد شاہ ابدالی کو یہ دعوت دی کہ ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کی حمایت کا فرض انجام دے اور جب ۱۸۵۷ء میں ہم نے آخری مغل تاجدار کو انگریزوں کے مقابلے میں کھڑا کیا تو "ایک شاہ مغرب" کے نمودار ہونے کی پیش گوئی سے ہماری ہمّت بندھی۔

اگر یہ بات تھی کہ ہم دنیائے اسلام کی افواج قاہرہ کے ہراول تھے تو پھر ہمارا اصلی وطن کہاں تھا؟ دنیائے اسلام کے قلب میں یا سامنے کے مورچوں پر؟ سپاہی مورچوں پر لڑتا ہے، لیکن روحانی و نفسیاتی طور پر وہ رہتا قلبِ وطن میں ہے، اسی لیے تو ہم فرغنہ کے ٹھنڈے چشموں، ایران و افغانستان کے پہاڑوں کی ٹھنڈی فضاؤں اور ان پر اگنے والے شمشاد و صنوبر اور لالہ و گل کے راگ گاتے رہے۔ اس کا سبب یہ خیال ہی تھا کہ ہمارا وطن دنیائے اسلام ہے اور اس دیار میں ہم مسافر ہیں۔ یہ بات ہمارے تحت الشعور میں ہی نہ تھی، شعور میں بھی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ ایک مقام پر رسم و رواج اور لباس کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ ہم تو اس دیار میں مسافر ہیں اور حالی کو جب ہماری حالتِ زار پر رونا آتا ہے تو بارگاہِ رسولؐ میں عرض کرتے ہیں کہ ان کا دین "پردیس میں" "غریب الغربا ہے"۔

اس احساس نے ہمارے اتحادِ اسلام کے جذبے کو ہمیشہ قوت بخشی اور اس دنیا میں ہمیں اتحادِ اسلام کا سب سے بڑا علمبردار بنایا۔ اسی سے چین و عرب و ہندوستان کے درمیان ہم نے تفریق نہ کی اور ساری دنیا کو ہم نے اپنا وطن سمجھا۔ غلامی کے زمانے میں یہ خیال ہمیں خاص طور پر ستاتا رہا کہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کا جو حشر ہوا، وہی اس برعظیم میں بھی نہ ہو۔ اس کے علاوہ خود غلامی کی ذلّت ہمارے لیے تکلیف دہ تھی اور اگر کچھ سکون میسّر آتا تھا۔

تو اس تصوّر سے کہ دنیا کے بہت سے حصّے ایسے تھے جہاں اسلام آزاد تھا اور مسلمان محکوم نہ تھے۔ لیکن جب روس نے وسط ایشیا پر قبضہ کر لیا، شمالی افریقہ کو برطانیہ، فرانس اور اطالیہ نے بانٹ لیا اور افغانستان، ایران و ترکی میں یورپ کا اقتدار بڑھتا گیا، تو ہمیں روحانی اذیّت پہنچی، اس لیے کہ ہمیں نفسیاتی طور پہ ان کا سہارا تھا اور اب یہ بھی بظاہر ہماری طرح غلامی کے شکنجے میں آ رہے تھے۔ ہمارا یہ اطمینان بھی رائیگاں گیا کہ ہماری ملّت کا اصل حصّہ تو آزاد ہے۔ اگر ہمیں ذلت نصیب ہوئی ہے تو خیر، اسلامی دنیا کا بڑا حصّہ خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ اسی احساس نے وہ طوفان اٹھایا جو تحریکِ خلافت کے نام سے تاریخ میں مذکور ہے۔

آپ ان تمام نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لیجیے اور ان کا اقبال کے فلسفے سے مقابلہ کیجیے۔ آپ کو اقبال کے تمام اساسی تصوّرات ان نفسیات میں ملیں گے۔ فلسفۂ اقبال کے اہم نفسیاتی منابع یہی ہیں۔ جو کچھ قوم کے دل میں تھا وہ اقبال کی زبان پر تھا۔ جب ہی تو یہ ہوا کہ اقبال کی تقریر کی لذّت ہمارے دلوں میں سرائت کر گئی اور ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کا ہر لفظ ہمارے دل میں جاگزیں ہے، اس لیے کہ فی الواقعہ وہ جاگزیں تھا۔ دنیا میں بہت سے مفکّر اور شاعر قومی مفکر اور قومی شاعر کہلاتے ہیں۔ انھوں نے تاریخ کے کسی موڑ پر قوم کی رہنمائی کی ہے اور قوم نے انھیں اپنا ترجمان یا رہبر تسلیم کیا ہے۔ لیکن اقبال کا درجہ ان میں سے کسی کو حاصل نہیں ہوا، اس لیے کہ اقبال قومی جذبات و محسوسات کے آئینہ دار ہیں۔ اقبال کے سینہ میں ان کا نہیں قوم کا دل دھڑکتا ہے۔ ان کے دماغ میں ان کے نہیں، قوم کے خیالات ہیں۔ ان کے افکار میں قوم کی ایک ہزار سے زیادہ سال کی تاریخ مضمر ہے۔ گویا قوم کی تمام امنگیں جمع ہو کر اقبال کے قالب میں ڈھل گئی ہیں۔ پاکستان کے لیے اقبال کی یہی اہمیّت نہیں ہے کہ انھوں نے ایک مسلم سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے سب سے پہلے مسلمانوں کے جداگانہ وطن کا تصوّر پیش کیا بلکہ اس سے زیادہ اہم یہ امر ہے کہ پاکستان جن قوتوں، نفسیات اور تقاضوں کے سبب سے وجود میں آیا ہے وہ اقبال کے تصوّرات میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ مقالہ طویل ہو گیا ہے۔ میں اتنی سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں اور آپ کا ممنونِ احسان ہوں کہ آپ نے اسے توجہ سے سُنا۔

٭